اقبالیات پر نقوش کا تحقیقی سرمایہ

ڈاکٹر سعدیہ نسیم

معروف علمی و ادبی جریدے 'نقوش' کا اجرا لاہور سے مسرور انور اور احمد ندیم قاسمی کی زیرِ ادارت مارچ ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ تین عام نمبروں کے بعد اسے منٹو کا افسانہ چھاپنے کے جرم میں چھ ماہ کے لیے حکومت نے بین کر دیا۔ جب دوبارہ شائع ہوا اور چھ سات نمبر مرتب کرنے کے بعد ندیم اور ہاجرہ بوجوہ ادارت سے دستبردار ہو گئے تو ادارت کے فرائض سید وقار عظیم نے سنبھال لیے۔ سال بھر بعد جب وہ بھی 'نقوش' سے الگ ہو گئے تو محمد طفیل نے اپنے رسالے کی ادارت، بذاتِ خود سنبھال لی اور تاحیات یعنی ۱۹۸۶ء تک نقوش کے مدیر رہے۔[۱]

اردو کی ادبی دنیا میں 'نگار'، 'ساقی'، 'نیرنگِ خیال'، 'عالمگیر'، 'ہمایوں'، 'ادبی دنیا' اور 'ادبِ لطیف' وہ جرائد ہیں جو عرصے تک جاری رہے اور ان میں سے بعض ابھی تک جاری ہیں ان رسائل نے نئے ادیبوں کے فن کو نکھارنے اور ان کی حوصلہ افزائی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ علم و ادب کا ایسا امتزاج پیش کرتے تھے کہ اہلِ علم و دانش انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ اسی دور میں رسالوں کے خاص نمبر نکالنے کی طرف توجہ ہوئی جن میں کسی خاص موضوع پر بھرپور مواد پیش کیا جاتا 'نیرنگِ خیال' سے سالناموں کا آغاز ہوا بلکہ مخصوص موضوع پر خاص نمبر کا آغاز بھی اسی سے ہوا۔ چنانچہ 'نیرنگِ خیال' نے پہلی مرتبہ "بانگِ درا" کی سائز پر ایک 'اقبال نمبر' شائع کیا۔ 'زمانہ' نے ایک ضخیم 'پریم چند نمبر' نکالا۔ 'عالمگیر' نے روسی ادب نمبر پیش کیا۔ 'ہمایوں' نے روسی ادب نمبر اور فرانسیسی ادب نمبر شائع کیے۔ لاہور سے مجید الملک (مرحوم) نے 'نرگس' کا غزل نمبر شائع کر کے ایک اور طرح ڈال دی۔[۲]

ادبی جرائد کی یہی دیرینہ ستھری علمی و ادبی روایات تھیں، محمد طفیل جن کے امین ٹھہرے۔ چنانچہ اپنی بھرپور توانائی اور لگن کے ساتھ انھوں نے رسالہ نہ صرف جاری رکھا بلکہ رسائل کی ان روایات کو تسلسل کے ساتھ برقرار بھی رکھا۔ وہی کام جو پہلے اکا دکا رسائل کبھی کبھی نامکمل اور غیر جامع انداز میں کرتے تھے، انھوں نے اسے ایک بڑے پیمانے پر نہایت منظم و جامع انداز میں مرتب کر کے انسائیکلوپیڈیائی رنگ دے دیا۔ 'شخصیات نمبر'، 'طنز و مزاح نمبر'، 'لاہور نمبر'، 'پطرس نمبر'، 'شوکت تھانوی نمبر'، 'سعادت حسن منٹو نمبر'، 'غزل نمبر'، 'افسانہ نمبر'، 'خطوط نمبر'، 'آپ بیتی نمبر'، 'اقبال نمبر'، 'رسول نمبر' اور بعض دیگر ایسے اہم اور نادر مواد پر مشتمل ہیں جو اگر یکجا نہ کیا جاتا تو اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔ سالنامے اس کے علاوہ ہیں۔ مزید برآں 'نقوش' کے عام شمارے بھی منتخب تحریروں کا عمدہ ذخیرہ ہیں۔ اس سے محققین کا کام آسان ہو گیا ہے کیونکہ انھیں جس قدر ماخذی مواد 'نقوش' کے خصوصی نمبروں، سالناموں اور عام شماروں میں تحقیق اور مستند صورت میں دستیاب ہے، اتنا بے شمار کتابوں، دستاویزوں اور فائلوں میں بھی نہ مل سکتا۔

'نقوش'، ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۶ء تک علم و ادب کے مختلف موضوعات پر سیر حاصل مواد پیش کرتا رہا۔ بقول خواجہ شہاب الدین 'نقوش' نے اردو ادب کی جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں، پوری ادبی دنیا اس کی معترف ہے۔ ادب کے مستند ناقدین نے 'نقوش' کو اس لحاظ سے منفرد قرار دیا کہ اس کے خاص نمبروں نے نہایت اہم تاریخی اور دستاویزی مواد فراہم کیا ہے۔ کہنے کو تو 'نقوش' ایک ماہنامہ ہے لیکن ادب کے مختلف موضوعات پر اس کے ضخیم خاص نمبر کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تمام خاص نمبر علم ادب کے ایسے انمول ذخیرے ہیں جن سے نہ صرف دورِ حاضر کے ادیب و نقاد، اور طالب علم استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ ان میں تاریخی اہمیت کی جو بیش بہا معلومات یکجا کر دی گئی ہیں ان سے آنے والی نسلوں کے ریسرچ اسکالر، ادیب، مبصر اور مؤرخ بھی مسلسل فیضیاب ہوتے رہیں گے۔ اپنے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے 'نقوش' کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

اس اجمالی جائزے سے 'نقوش' کا معیار بخوبی متعین کیا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف ان تحقیقی خدمات کا احاطہ مقصود ہے جو 'نقوش' نے اقبالیات کے سلسلے میں سرانجام دیں۔ محمد طفیل کو اقبال کے ساتھ قلبی انس اور ذہنی وابستگی تھی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ 'نقوش' کے مختلف شماروں میں اقبال پر مضامین و مقالات شائع کرنے کے علاوہ ایک ضخیم 'اقبال نمبر' شائع کیا۔ اقبال پر مزید

مواد یکجا کر دینے کی آرزو کی تکمیل میں انھوں نے 'نیرنگ خیال' کے 'اقبال نمبر' کو 'نقوش' ہی کے سائز اور صورت میں شائع کیا۔ اس طرح اقبال پر بیک وقت جس قدر مواد بآسانی، یکجا اور محقق صورت میں دستیاب ہے، اس کا حصول کسی اور ذریعے سے اتنا آسان و امکانی نہیں۔ اس کے علاوہ اقبال سے متعلق بہت سی نادر و نایاب دستاویزات بھی نقوش کے ان نمبروں میں محفوظ کر دی گئی ہیں اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ نہایت عمدہ تحقیقی سرمایہ ہے۔

۱۹۶۸ء میں اپنی بیسویں سالگرہ کے موقع پر 'نقوش' نے خطوط نمبر شائع کیا۔ مشاہیر ادب کے خطوط سے مزین یہ نمبر تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں دیگر خطوط کے علاوہ علامہ اقبال کے آٹھ غیر مطبوعہ خطوط بنام گرامی اور تین مزید خطوط بالترتیب ڈاکٹر حبیب النساء، عبدالسلام ہزاروی سلیم اور رشاد عظیم آبادی کے نام شامل ہیں۔

مولانا گرامی کے نام پہلا خط جس پر تاریخ و سن کا اندراج نہیں اور جس کے بارے میں ادارے نے سنہ اور سنہ کے درمیانی زمانے کا قیاس کیا ہے، اس خط میں اقبال اپنی ملازمت سے متعلق لکھتے ہیں:

"مہاراجہ صاحب بہادر سے ملاقات ہوئی میں نے انھیں کے دولت خانے میں قیام کیا اور دل کو ان کے شکریوں سے مملو واپس لایا۔ ملازمت سے متعلق انھوں نے مجھ سے گفتگو کی تھی مگر کوئی خاص بات نہ تھی عام گفتگو تھی جس سے میں ان کا عندیہ معلوم نہ کر سکا۔ بہرحال مجھے بیتابی نہیں۔ مقدر کا قائل' جو شخص ہوا، اس کی طبیعت مطمئن رہتی ہے۔ مجھ کو، جہاں ہوں اپنے فرائض مفوضہ کی ادائیگی سے کام ہے۔ خواہ لاہور میں ہوں، خواہ لندن میں، کسی خاص جگہ ملازمت کرنے کی خواہش بھی دل میں پیدا نہیں کرتا، کیونکہ سراپا تن بہ تقدیر ہوں۔"[۲]

اس سے علامہ کی ذات و شخصیت اور نجی معاملات میں ان کی درویشں منشی پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا گرامی کے نام ایک اور خط میں انھیں وعدہ تقریظ کی جانب متوجہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"مثنوی کا دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے۔ تقریظ موعودہ لکھیے۔ وقت پر اطلاع کر دی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی تقریظ کے لیے اس کی اشاعت کو روکنا پڑے۔"[۳]

ان کے نام اپنے ایک اور خط میں اپنے خطاب یافتہ ہونے کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"آپ نے سن لیا ہو گا کہ امسال اقبال خلافِ توقع خطاب یافتہ ہو گیا۔ اس اعزاز کی

اطلاع میں آپ کو خود دیتا مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں وہاں اس قسم کے واقعات احساسِ انسانی سے بہت نیچے ہیں۔"

ایک دوسرے خط میں مولانا کو اپنی اہلیہ کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے مادۂ تاریخ وفات نکالنے کی استدعا کی ہے:

"فی الحال بہ رنج دہ خبر آپ کو دیتا ہے کہ میری لدھیانے والی بیوی ۲۱ اکتوبر کو یہاں لدھیانے میں انتقال کر گئی...... مرحومہ گزشتہ دس بارہ سال میری زندگی میں شریک رہیں........ آپ سے التماس ہے کہ کوئی عمدہ مادۂ تاریخ نکالیے جس کو ان کے مزار پر کندہ کرایا جائے۔ میں خود بھی فکر کروں گا چونکہ آپ بزرگ ہیں اس واسطے تبرکاً آپ سے مادۂ تاریخِ وفات کی درخواست کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر حبیب النساء پروفیسر اردو، میسور، جس زمانے میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) میں اردو ایم اے کے لیے ایک مقالہ بعنوان "اقبال کی تصانیف میں تصوف کا عنصر" لکھ رہی تھیں، انھوں نے علامہ اقبال کو ان کی کتاب "ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا" کے لیے لکھا تھا۔ علامہ جواب میں لکھتے ہیں:

"مجھے یہ کہتے ہوئے انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ آپ نے جس کتاب کا ذکر میرے خط میں کیا ہے، وہ میرے پاس نہیں ہے۔ یہ تیس سال پہلے لکھی گئی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ اب تک یہ کتاب کافی قدیم اور دوبارہ چھپ نہیں رہی ہے۔ بہتر ہے، اس کے پبلشرز میسرز لوزاک اینڈ کمپنی اورینٹل بک سیلرز مقام برٹش میوزیم لندن کو لکھ ڈالیے اور دریافت کیجیے کہ آیا ایک نسخہ روانہ کر سکتے ہیں؟ اس کا اردو ترجمہ کچھ مہینے پہلے حیدر آباد میں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مترجم کا نام و پتا نہیں معلوم۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اقبال کو اپنے متعلق ہونے والے کام کو محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہ تھی بلکہ یہ بھی کہ خود اپنی تصانیف کو اپنے پاس محفوظ رکھنے کی فکر اور فرصت نہ تھی۔

مولوی عبدالسلام ہزاروی کے نام اپنے مکتوب میں اقبال نے ان کے عربی قصائد کی تعریف کی ہے۔ البتہ شاد عظیم آبادی کے نام اپنے خط میں اقبال نے ایک جانب ان کی خیر و عافیت پر اظہارِ اطمینان کیا ہے اور دوسری جانب ان کی پیرانہ سالی کے باوجود اُن کی ادبی مصروفیات کو سراہا ہے:

"مجھے یقین ہے کہ آپ کی تصانیف تمام ملک کے لیے مفید ہوں گی اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی تکمیل کے لیے دیر تک سلامت رکھے جس تمدنی نظام نے آپ کو پیدا کیا، وہ تو اب رخصت ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیت اور اس کے گراں بہا نتائج اس ملک کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظام تمدن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں ہے۔ کاش عظیم آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔"[۵]

۱۹۷۷ء میں 'نقوش' کا 'اقبال نمبر' شائع ہوا۔ اس کا شمارہ نمبر ۱۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء میں اور شمارہ نمبر ۱۲۳ دسمبر ۱۹۷۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ 'اقبال نمبر' کی ان دو جلدوں کے درمیان اس کا شمارہ نمبر ۱۲۲ منظر عام پر آیا۔ یہ 'نیرنگِ خیال' کا اقبال نمبر تھا جسے محمد طفیل نے 'نقوش' کی طرف سے دوبارہ شائع کیا۔

"اقبال نمبر جلد اوّل کی فہرست مشمولات کو چار بڑے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے حالات و واقعات، اقبال اور عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اقبال جن سے متاثر ہوا، اقبال کی شخصیت و فن کے چند پہلو۔ اس کے علاوہ اقبال سے متعلق گمشدہ دستاویزات کی بازیافت، اقبال کے مضامین، خطوط، تقاریر، بیانات، خطبات و دیگر تفصیلات کو آخر میں شامل کیا ہے۔

پہلے عنوان کے تحت دو مضامین ہیں 'حیات نامۂ اقبال' از پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اور 'حیاتِ اقبال' از پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ دوسرے عنوان کے ذیل میں چار مضامین ہیں 'علامہ اقبال بارگاہِ رسالت مآبؐ میں'، 'اقبال اور روحانیت'، 'اقبال چند عاشقانِ رسولؐ کے حضور' اور 'علامہ اقبال کی دعائیں'۔ یہ بالترتیب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ڈاکٹر محمد ریاض اور میرزا ادیب کی تحقیقی کاوشیں ہیں۔ تیسرے عنوان "اقبال جن سے متاثر ہوا" کے تحت اقبال اور ابن عربی، اقبال اور عراقی، اقبال اور حافظ، اقبال اور سنائی، اقبال اور غالب، اقبال اور اس کے دو معاصرین، شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں بالترتیب ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، بشیر احمد ڈار، ڈاکٹر عبدالغنی اور خواجہ عبدالرشید شامل ہیں۔ چوتھے عنوان "اقبال کی شخصیت و فن کے چند پہلو" کے ذیل میں انیس تحریریں ہیں۔ یوں تو یہ تمام ہی اعلیٰ اور فکر انگیز تحریریں ہیں لیکن اختصار کے خیال سے بلا امتیاز چند کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے جیسے اقبال، 'گلشنِ رازِ قدیم و جدید'، 'اقبال، جاوید نامہ' کا ایک پہلو، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ وغیرہ ان انیس تحریروں میں سے ہر ایک اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ہر ایک میں اقبال کی شخصیت

اور فکر و فن کے ایک نئے ہی پہلو سے متعارف کرایا گیا ہے۔ میکش اکبر آبادی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر سلیم اختر، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، پروفیسر ملک حسن اختر اور ڈاکٹر عبدالسلام خورشید جیسے معروف اہلِ قلم اس میں شامل ہیں۔ اس تمام تحقیقی سرمائے کو موجودہ مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں لہٰذا بلا امتیاز صرف چند کا لبِ لباب پیش کیا جاتا ہے۔

"علامہ اقبال، بارگاہِ رسالت مآبؐ میں" ایک وقیع مقالہ ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں جیسے جید عالم و محقق نے اپنے اس مقالے میں مختلف حالات و واقعات کے مستند حوالوں کے ساتھ اقبال کے ذہنی ارتقا کے مختلف مدارج نمایاں کیے ہیں۔ حسبِ موقع آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ذریعے اس کو مزید توسیع و ہمہ گیریت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اقبال کی تصانیف کے تذکرے کے ساتھ ان کے پسِ پردہ محرکات بھی اجاگر کیے ہیں۔

میرزا ادیب نے "اقبال کی دعائیں" میں اشعارِ اقبال کے حوالے سے اقبال کی دعاؤں کی توضیح کی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعا ہے "اے اللہ! مجھے ہر شے کی اصل حقیقت کا علم عطا کر"۔ اقبال کی دعاؤں کی نثر میں بھی روح کارفرما ہے۔ اگرچہ علامہ اقبال نے مختلف موقعوں پر اپنے اشعار کی صورت میں جو دعائیں مانگی ہیں، ان میں متنوع آرزوؤں کا اظہار ملتا ہے۔ کہیں وہ خودشناسی و خودنگری کے طالب ہیں، کہیں ایسی نظر کے جو شراب کے اندر موجود نشے تک کو دیکھ لے یعنی شے کی اصل حقیقت تک رسائی ہو۔ کبھی اقبال حقیقت آشنائی کے جو بالنظر آتے ہیں تو کبھی اس درجہ یقینِ محکم کے طالب کہ جس کام کا ارادہ کر لیں، سوچتے ہی اس میں کامیاب ہو جائیں۔ اقبال چاہتے ہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے قلب و ذہن، بصیرت و بصارت پر منکشف کیا ہے، وہ اوروں کو بھی دکھلا دے تاکہ ان میں بھی وہی جوش و جذبہ اور وہی ہیجان و اضطراب جنم لے لے جو فکرِ اقبال کا خاصہ ہے۔ اقبال خدا سے اس بات کے آرزومند بھی ہیں کہ غیر کی احتیاج سے محفوظ رہیں۔ بلکہ ان کی تمنا تو یہ ہے کہ ان کا مقام تمام ہمسفروں سے اس قدر آگے ہو کہ کارواں ان کی ذات کو منزلِ مقصود سمجھ لے۔ جہاں وہ شوقِ تماشا کے طلبگار ہیں وہاں ذوقِ تقاضا بھی خدا سے مانگتے ہیں، کہ شوقِ تماشا میں آرزومندی ہے مگر ذوقِ تقاضا میں تحرک و فعالیت میرزا ادیب نے اقبال کی ظاہری شخصیت کے پسِ پردہ ان کی فعال و مضطرب روح، ان کے اندازِ فکر، ان کے ولولوں اور حوصلوں اور ان کی ان خواہشات و تمناؤں کی توضیح و تصریح بھی کی ہے

جنھوں نے اقبال کو اقبال بنا دیا۔ گویا انسان دراصل وہ نہیں ہوتا جو بظاہر نظر آتا ہے بلکہ درحقیقت وہ ہوتا ہے جو وہ سوچتا ہے۔ اس اعتبار سے انسان کی آرزوؤں اور تمناؤں کی بھی اتنی جگہ بڑی اہمیت ہے، انھی کی بدولت انسان ایک ایسے سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے جو اسے دوسروں سے منفرد و ممتاز بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی نے اقبال کے "نظریۂ تاریخ"[۱۲] سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں خصوصی حوالے کے بطور علامہ اقبال کے خطبات "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کو مدِنظر رکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ اقبال کے نزدیک ماضی کے واقعات و حوادث کو محض تاریخ وار دیکھنے یا بیان کر دینے کا نام تاریخ نہیں بلکہ اس میں ان واقعات و حوادث کے اسباب و علل کو سمجھنے، ان کے باہمی ربط و تعلق کو جاننے اور ان کی روشنی میں افراد و اقوام کے عروج و زوال کے اصول اخذ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ چنانچہ تاریخ محض انسانی محرکات کی توجیہ و تفسیر ہے، اسی لیے اقبال کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ اس قدر اہم ہے کہ وہ اپنے خطبات میں، قرآن مجید کے حوالے سے مشاہدات باطن اور عالم فطرت کی طرح تاریخ کو بھی علم انسانی کا ایک سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے نظریۂ تاریخ کے مطابق تاریخ کی حرکات کے اسباب اور قوموں کے عروج و زوال کے قوانین خارجی نہیں، بلکہ داخلی ہیں یعنی خود انسان کے اندر کارفرما ہیں۔ چنانچہ اقبال، ارتقائے حیات کے پیچھے آرزوؤں اور تمناؤں کا دستِ قدرت کارفرما دیکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ مقصد کی لگن اور حصولِ آرزو کی تڑپ ہی ہے جو دلوں کو بے قرار رکھتی ہے۔ یہی بے قراری اپنی خواہش کے مطابق خارج میں واقعات کو ڈھالتی اور اسباب پیدا کرتی ہے۔ خارج میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اصل میں آرزوؤں اور تمناؤں کے باطنی سرچشمے کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ چنانچہ تہذیب و تمدن کے سارے سامان اور تنظیم و ارتقاء کے تمام اسباب آرزو و تمنا ہی کی بدولت معرضِ وجود میں آتے ہیں، غرض انسان وہی کچھ بنتے اور حاصل کرتے ہیں جس کے بننے اور حاصل کرنے کی تمنا ان کے دلوں میں موجزن ہوتی ہے۔ ہم تخلیق مقاصد کے باعث ہی زندہ و متحرک ہیں اور ہماری زندگی میں جس قدر چمک اور تابناکی ہے وہ آرزوؤں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر شمس الدین کا یہ مقالہ اقبال کے نظریۂ تاریخ کے حوالے سے تکمیلِ انسانی ارتقا کا ایک لائحہ عمل تجویز کرتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخ کا تمامتر عروج و زوال انسانی اعمال ہی کی نسبت سے ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا مقالہ "اقبال اور بیداریٔ ذات" تفہیم اقبال کے سلسلے میں ایک اثر رکھے

انداز کا حامل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال کے نظامِ فکر میں عشق اور خرد دونوں ایک ہی سفر کے دو مراحل ہیں۔ ابتداءً عقل کا تحلیلی اور تجزیاتی عمل ہے جو عشق کے وجدانی عمل میں ضم ہو جاتا ہے۔ عشق دائرے میں حرکت کرتا ہے اور اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے تا آنکہ مزاج یابے۔ تخلیق کی وہ صورت وجود میں آتی ہے جسے خود فراموشی کا نام ملنا چاہیے۔ اس عالم میں دائرے کی لکیر ٹوٹتی ہے اور عشق کی رفتار کائنات کی رفتار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یہ لمحۂ تخلیق کا لمحہ ہے جس میں انسان بے خودی کے عالم سے ایک نئی ہیئت کو جنم دیتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اپنے شعور و بصیرت کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ گویا ابتدائی مراحل میں عقل اور شعور کے جو عناصر اس کی ذات میں جذب ہوئے تھے وہ انتہائی مراحل میں آگہی کی تشکیل میں اس طور شامل ہو گئے کہ بے خودی کے باوصف خودی وجود میں آگئی اور انسان کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنی ذات کو نہ صرف بے خودی میں کھو جانے سے باز رکھے بلکہ اسے کائنات کی تخلیقی قوت کے سامنے ایک متوازی قوت کے طور پر ابھار دے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک یہ فن کے تخلیقی عمل سے مشابہ عمل ہے۔

مزید برآں وہ اقبال کے بعض اشعار سے استخراجِ نتائج کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال کے یہاں یہ خیال اب پختہ ہونے لگا تھا کہ روشنی کہیں باہر نہیں بلکہ ذات کے تجلی زار میں مستور ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انکشاف تھا جو یقیناً سوچ بچار کا نہیں بلکہ کشف اور روحانی تجربے کا ثمر تھا۔ اب اقبال روشنی کے کسی خارجی نقطے کی طرف لپکنے کے بجائے اپنی ہی ذات کے مرکزی نقطے میں آباد ہو گئے تھے۔ اس مرکزی نقطے کو انھوں نے "تجلی زار" کا نام دیا۔ گویا پہلے جو روشنی انھوں نے باہر کی دنیا میں دیکھی تھی وہ اب ان کے اندر نمودار ہو گئی تھی۔ اسے انھوں نے کرمکِ ناداں کے بجائے اب کرمکِ شب تاب کے روپ میں پیش کیا۔ اب وہ شمع کے متلاشی نہیں رہے تھے بلکہ خود شمع بردار تھے اور جہانِ تاریک میں جہاں سے گزرتے ہر شے ان کے وجود کے دائرے میں آ کر روشن ہو جاتی۔

مقالہ نگار نے اس کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کا باطن تجسس کے ادوار کو عبور کر کے ایک ایسی آگہی پا چکا جو نہ سے بہرہ مند ہو گیا جس کے لیے مناسب ترین لفظ آگہی ہے اور آگہی نہ تو عشق ہے اور نہ عقل۔ گو اس میں عشق کا مہیا کردہ جلوہ بھی موجود ہے اور عقل کا مہیا کردہ شعور بھی۔ آگہی، بیداریِ ذات یا شعورِ ذات کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں عشق

اور عقل کی تفریق ختم ہو جاتی ہے اور انسان کائنات کی تخلیقی سطح پر سانس لینے لگتا ہے۔ اقبال نے آگہی کے اس روپ کے لیے خودی کا لفظ استعمال کیا ہے جو ہر اعتبار سے مستحسن ہے۔[1]

یہ صرف نمونتاً چند مقالات کا اجمالی تعارف ہے جبکہ اس جلد میں شامل ہر مقالہ اپنے موضوع اور اسلوب، اپنے مآخذ اور معلومات کے اعتبار سے منفرد ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر نجم الاسلام کے مقالے "رسالہ معارف اور اقبال" کا تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقالہ رسالہ معارف اعظم گڑھ اور اقبال کے علمی و ادبی روابط کا ایک جائزہ ہے جو رسالے معارف کے ابتدائی شمارے جولائی ۱۹۱۶ء سے، مئی ۱۹۲۶ء تک، دس برس کے اہم شماروں سے اخذ کردہ اہم معلومات پر مبنی ہے۔ رسالہ معارف کے مدیر سید سلیمان ندوی کے ساتھ اقبال کے مراسم تھے۔ رسالہ معارف کے مذکورہ جائزے سے اس تعلق کی یک طرفہ نوعیت سامنے آتی ہے یعنی سید سلیمان ندوی کے خیالات و نظریات اقبال کی تصنیفات، ان کی شاعری اور ان کی علمی و ادبی حیثیت سے متعلق کیا تھے لیکن دوسرا پہلو یعنی اقبال کے روابط اس سلسلے میں ان کے ساتھ کیسے تھے، تشنہ رہ گیا ہے۔ اس تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے فاضل محقق نے مکاتیبِ اقبال کے حوالے سے سید سلیمان ندوی کے اقبال کے ساتھ روابط کا دوسرا پہلو یعنی اقبال کے مدیر 'معارف' کے ساتھ مراسم کی نوعیت کی توضیح کی ہے جس سے ان کے پہلے مقالے کے بعض گوشوں کی مزید تصریح ہوتی ہے۔ ان کا یہ دوسرا مقالہ اقبال نمبر جلد دوم میں شائع ہوا۔

'اقبال نمبر' جلد اول کے حوالے سے پروفیسر سلیم اختر کے مقالے "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ" کا تذکرہ بھی یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ علامہ اقبال کی شاعری کے نفسیاتی محرکات اور جذباتی عوامل کو زیرِ بحث لائے ہیں جس پر ابھی تک کم توجہ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بعض دوسرے ذرائع معلومات کے علاوہ انھوں نے اقبال کی نوٹ بک Stray Reflections اور عطیہ فیضی کے خطوط کو اپنے تجزیاتی مطالعے میں شامل کرتے ہوئے بہت سے حقائق و امکانات کو بے نقاب کیا ہے جن سے اقبال پر تحقیق کے کچھ اور پہلو سامنے آتے ہیں۔ پروفیسر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ گو اقبال نے یورپ جانے سے پہلے ہی شاعری شروع کر رکھی تھی لیکن ابھی تک اپنے لیے نہ تو کوئی شاعرانہ مسلک اختیار کیا تھا اور نہ ہی کوئی قوی نقطۂ نظر واضح تھا۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ اس کے تحت الشعور میں ہو لیکن اقبال، اقبال نہ بنا تھا اس لیے اس دور کے ان واقعات و حوادث کی بے حد اہمیت ہو جاتی ہے جو کسی نہ کسی طرح سے بالواسطہ یا بلاواسطہ

طور پر اقبال کے جذبات میں ہلچل پیدا کرنے کے بجائے کسی محرک کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک اقبال کو ایک مفکر، مصلح اور فلسفی کے روپ میں پیش کرنے والے یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ بھی جوان ہوگا اور قلب و نظر اور ذہن، متنوع اثرات کی آماجگاہ بھی بنے ہوں گے۔ چنانچہ اسی اہم نکتے پر انھوں نے اپنی تحقیق کی اساس رکھی ہے اور اس سلسلے میں بہت سے دلچسپ اور اہم حقائق بیان کیے ہیں نیز اس امر کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ اس موضوع پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

'نقوش' کا شمارہ ۱۲۲، "نیرنگِ خیال" کا اقبال نمبر تھا جو حکیم یوسف حسن کی ادارت میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں محمد طفیل نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ 'نیرنگِ خیال' کے 'اقبال نمبر' کی اہمیت و خصوصیت اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ یہ پہلا اقبال نمبر تھا جو علامہ اقبال کی زندگی ہی میں چھپا تھا۔ محمد طفیل نے اس کو دوبارہ شائع کرتے ہوئے یہ اضافہ کیا کہ "نیرنگِ خیال" کی پرانی فائلوں میں موجود مضامین میں سے کچھ مضامین انتخاب کر کے اس میں شامل کر دیے۔ طبع اوّل میں حسبِ ذیل مضامین و مقالات شامل تھے۔

اقبال اکاڈیمی	ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال
فلسفۂ سخت کوشی	علامہ سر اقبال کے استاد
اقبال کی شاعری	اقبال اور اسلامی دنیا کے دیگر شعرا
پیامِ اقبال	مثنویاتِ اقبال
اقبال اور سیاسیاتِ عالیہ	جاوید نامہ
متفاوتِ اقبال	اقبال کی شاعری پر قیامِ یورپ کا اثر
اقبال ایک ریفارمر کی حیثیت سے	علامہ اقبال اور فلسفۂ تصوف
کلامِ اقبال کی ادبی خوبیاں	پیامِ مشرق
اقبال ایک مصلح کی حیثیت سے	ٹیگور اور اقبال
اقبال پر ایک محققانہ نظر	شاعرانِ عالم اور شاعرِ اسلام
میر، غالب اور اقبال	تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ
اقبال اور فلسفۂ مغرب	

لکھنے والوں میں اقبال کے دور کے بعض اہم اور معروف اہلِ قلم شامل ہیں مثلاً

سر تیج بہادر سپرو	منشی محمد دین فوق
چراغ حسن حسرت	قاضی عبدالغفار
محمد اسلم جیراجپوری	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
ڈاکٹر نکلسن	مرزا عسکری
حامد حسن قادری	پروفیسر نذیر نیازی

اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اس نمبر میں ایک حصہ منظومات پر مشتمل ہے۔

طبع دوم میں محمد طفیل نے مندرجہ ذیل مضامین و مقالات مزید اضافہ کیے۔

اسلام، قومیت اور وطنیت	بانگِ درا
رومی، نطشے اور اقبال	سر محمد اقبال
اقبال کا پیغام	حیاتِ اقبال
فلسفۂ اقبال	اسماء الرجالِ اقبال
اقبال کا الہیاتی فلسفہ	بالِ جبریل سرسری نظر سے
ارمغانِ حجاز	فلسفۂ اقبال میں راہِ حیات
اقتباسات از افکارِ مفکرینِ حاضرہ	اقبال اور شعر و شاعری
اقبال کا پیام	اقبال کی شاعری کے تین دور
اقبال کی اردو شاعری	اقبال اور بھرتری ہری
اقبال کے بدلتے ہوئے نظریات	اقبال اور اسلام
اقبال کا نظریۂ خودی	طبقۂ نسواں اور علامہ اقبال
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق	ارمغانِ حجاز
اقبال کے فلسفے کی ایک جھلک	اقبال اور ٹیگور
اقبال پر بعض فضلا کی حرف گیری	اقبال پر ایک اعتراض کا جواب
اقبال اور عصرِ حاضر کی سیاسی تحریکات	اقبال اور ہمارے فرائض
اقبال اور نیرنگِ خیال	

اس حصے کے مندرجہ ذیل اہلِ قلم نمایاں ہیں:

مولوی عبدالحق	خلیفہ عبدالحکیم

پطرس	دیا نرائن نگم
سید نجیب اشرف ندوی	ڈاکٹر تاثیر
البگزنڈر یوسانی (اطالوی)	سید نذیر نیازی
سہا مجددی	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر سید عابد حسین اور	تمکین کاظمی[۱۵]

نقوش کا ایک سو تیئسواں شمارہ، اقبال نمبر (جلد دوم) دسمبر ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کی فہرستِ مشمولات سات عنوانات پر منقسم ہے۔

خطوط	تاریخ ولادت
فکر و فن	اقبال کے حضور
مداح و ممدوح	قیام و تعلق

رحلت۔

خطوط کے ذیل میں عطیہ صلاح الدین محمود کے فراہم کردہ اقبال کے سات عدد غیر مطبوعہ مکتوبات شائع کیے گئے ہیں۔ یہ مکتوبات پروفیسر محمد عمر الدین (مرحوم) کے جمع کردہ "ذخیرۂ خطوط" کا ایک حصہ ہیں۔ ان میں سے تین خط تعارفی ہیں جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن (مرحوم) کے لیے لکھے گئے ہیں۔ باقی چار میں سے دو پروفیسر عمر الدین کے نام اور دو ڈاکٹر سید ظفر الحسن کے نام ہیں۔

تاریخ ولادت کے تعین کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کے تحقیقی مقالات دیے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اختلافی آرا پیش کرتے ہوئے اقبال کے تعلیمی اور میونسپل ریکارڈ کے حوالوں سے تاریخ و سنِ ولادت کا تعین کیا ہے[۱۸]۔

"فکر و فن" کے ذیل میں پچیس مضامین و مقالات ہیں جن میں اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں اور ماخذ پر روشنی ڈالی گئی ہے لکھنے والوں میں بعض بڑے نام بھی موجود ہیں مثلاً

مولانا امتیاز علی عرشی	پروفیسر رشید احمد صدیقی
ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	ربیع الدین ہاشمی
محمد طاہر فاروقی	پروفیسر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر سید محمد عقیل	انور سدید

جگن ناتھ آزاد — ڈاکٹر نجم الاسلام
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار — ڈاکٹر فرمان فتح پوری — اور
پروفیسر سلیم اختر

"اقبال کے حضور" میں آٹھ مقالات دیے گئے ہیں جن میں اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملاقاتوں، بیتی یادوں اور ان کے زیر سایہ تاثرات پر مبنی یہ تحریریں

خواجہ عبدالوحید — ابوالاثر حفیظ جالندھری
میاں محمد شفیع (م۔ش) — ڈاکٹر سید عبداللہ چغتائی
میاں عبدالعزیز مالواڈہ — میاں عطاء الرحمٰن
حکیم یوسف حسن — اور — ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

کی معلومات اور یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔

"مداح اور ممدوح" کے تحت سات مقالات دیے ہیں

نطشے اقبال و رومی — اقبال اور گرامی
اقبال اور اکبر الہ آبادی — اقبال اور سید سلیمان ندوی
اقبال اور ابوالکلام آزاد — اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم
اقبال اور مہر و سالک

یہ اہم مقالات

مولانا عبدالماجد دریا بادی — محمد عبداللہ قریشی
قاضی افضل حق قریشی — پروفیسر طاہر تونسوی
پروفیسر محمد عثمان — اور — ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

"قیام و تعلق" کے سلسلے میں پانچ تحریریں شامل ہیں

اقبال کا لاہور — اقبال اور قیام یورپ
اقبال اور حیدرآباد (دکن) — اقبال اور بھوپال سے تعلق
اقبال اور بہاولپور

لکھنے والوں میں یہ اصحاب قلم شامل ہیں

حکیم احمد شجاع — کسریٰ منہاس

میر محمود حسین　　　　پروفیسر عبدالقوی دسنوی　　　　اور

بریگیڈیئر نذیر علی

"رحلت" (گمشدہ اوراق) آخری عنوان ہے۔ جن گمشدہ اوراق کو اس حصے میں شامل کیا گیا ہے، ان کی بازیافت کا سہرا مولانا غلام رسول مہر کے سر ہے جن کی شخصیت دنیائے ادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔

اقبال نمبر کی یہ مذکورہ جلدیں یوں تو اپنے تحقیقی مآخذ اور نادر و نایاب مواد کی بازیافت کے اعتبار سے بڑی وقعت کی حامل ہے تاہم اس کے چند مقالات کا بلا امتیاز تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اقبال کی موعودہ تصانیف، اقبال مغربی خاور شناسوں کی نظر میں اور اقبال کی نظر میں علوم جدیدہ۔

اقبال کے فکری ارتقا میں یہ پہلو خصوصیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔

رفیع الدین ہاشمی کا مقالہ "اقبال کی موعودہ تصانیف" ان تصانیف سے بحث کرتا ہے جن کا خاکہ اقبال ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے اور چاہتے تھے کہ ضروری مواد کی فراہمی اور ذہنی فراغت میسر آتے ہی انھیں ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے "مقدمۃ القرآن" کا تذکرہ ہے۔

علامہ اقبال بہت ابتدا ہی سے قرآن حکیم سے عشق کی حد تک گہرا ذہنی اور قلبی تعلق رکھتے تھے تلاوتِ قرآن سے انھیں خصوصی شغف تھا اس ذوق و شوق اور حضورِ قلب کے ساتھ تلاوت فرماتے کہ آنکھوں میں بے اختیار آنسو امنڈ آتے اور رقت طاری ہو جاتی۔ عربی زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے نیز قرآن حکیم کا مطالعہ دقتِ نظر کے ساتھ کیا تھا۔ انھیں یقین کامل تھا کہ قرآن حکیم کائنات کے ہر مسئلے اور زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے چنانچہ قرآنی مباحث و تعلیمات پر تفہیمِ قرآن کی خاطر اقبال اپنے نقطۂ نظر سے کچھ لکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کے برسوں کے غور و فکر کے نتائج سے امتِ مسلمہ مستفیض ہو سکے۔ لیکن ضروری مواد کی عدمِ فراہمی اور ذاتی علالت کے سبب وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

"اسلامی فقہ کی تاریخ" ایک اور اہم موضوع تھا جو اقبال کے ذہن میں جگہ بنائے رہا۔ ان کے خیال میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین تھی جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی

سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ اس کام کا آغاز اقبال کر چکے تھے لیکن تشنۂ تکمیل رہا۔ اس سلسلے میں مقالہ نگار نے اقبال کے "رسالۂ اجتہاد" کی نشاندہی کی ہے جو ان کے نزدیک اسلامی فقہ کی تاریخ و تدوین کا ایک حصہ تھا اور ناکافی و نامکمل ہونے کے سبب اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔

اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے ساتھ ہی ہندوستان کے اہلِ تصوف نے، اقبال کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ اس مخالفت میں ان کے قریبی دوست خواجہ حسن نظامی پیش پیش تھے۔ اقبال کو اپنے نقطۂ نظر کی صراحت کے لیے بہت سی وضاحتیں کرنی پڑیں۔ "تاریخِ تصوف" کی تصنیف کا ارادہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ دو ایک باب لکھ بھی چکے تھے لیکن متعلقہ مواد دستیاب نہ ہونے کے سبب یہ کام بھی التوا کی نذر ہو گیا۔ البتہ چار مضامین "اسرارِ خودی اور تصوف"، "سرِ اسرارِ خودی"، "علم ظاہر و علم باطن" اور "تصوفِ وجودیہ" اقبال کے وہ مضامین ہیں جو "وکیل" امرتسر میں جنوری ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۱۶ء کے درمیان شائع ہوئے۔ مقالہ نگار کے نزدیک یہ مضامین اقبال کی موعودہ تصنیف "تاریخِ تصوف" کا لبِ لباب ہیں۔

اقبال کی ذہنی نشو و نما میں سہ سالہ قیامِ یورپ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دوران اُن کے خیالات میں عظیم تغیر واقع ہوا۔ بقول اقبال یورپ کی آب و ہوا نے انھیں مسلمان کر دیا۔ ذہنی انقلاب کی اس سرگزشت کو اقبال نے "دل و دماغ کی سرگزشت" کے عنوان سے قلمبند کرنے کا ارادہ اپنے مختلف خطوط میں ظاہر کیا ہے جن کا اندراج مقالہ میں کیا گیا ہے۔

"ایک فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب" کے عنوان سے اقبال ایک اور کتاب کا خاکہ بھی بنا چکے تھے۔ ان دو خطوں سے ظاہر ہے کہ وہ نطشے کی ایک کتاب Also sprach Zarathastra. کی طرح ایک نئی تصنیف What an unknown Prophet. کے نام سے مرتب کرنے کے آرزومند تھے اس کے لیے مناسب ادبی اسلوب کے متلاشی رہے چنانچہ یہ کتاب لکھی نہ جا سکی۔

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کے بعد اقبال مثنوی کا تیسرا حصہ "حیاتِ مستقبلۂ اسلامیہ" لکھنا چاہتے تھے۔ اس میں ان کے پیشِ نظر یہ امر تھا کہ قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے، نیز جماعتِ اسلامیہ جس کی تاسیس دعوتِ ابراہیمی سے شروع ہوئی کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے، اور بالآخران سب واقعات کا مقصود اور

غایت کیا ہے لیکن ان کا یہ ارادہ بھی عملی صورت میں ظہور پذیر نہ ہو سکا۔

اقبال، ابن عربی کے عقائد و نظریات پر تنقید بعنوان "فصوص الحکم پر تنقید" لکھنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک 'فصوص' میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں، لیکن اقبال اسے تحریر کرنے سے قاصر رہے۔

اقبال کے ایک مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی کتاب songs of Modern David. کے نام سے لکھ رہے تھے۔ فاضل مقالہ نگار کے نزدیک عین ممکن ہے یہ وہی کتاب ہو جو ۱۹۲۷ء میں "زبور عجم" کے نام سے شائع ہوئی۔

سر تھیوڈور ماریسن، سیکرٹری آف اسٹیٹ کی جانب سے اقبال سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اردو ادب کی تاریخ لکھیں۔ یہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کا ایک باب ہوتا لیکن کسی سبب سے وہ یہ مقالہ نہ لکھ سکے۔

اقبال پشتو شاعری کے انتخاب کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر افغان شاعری کے جوشیلے اور حیات بخش اسلوب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ پشتو شاعری کو اردو میں ڈھال دینے کی خواہش ان میں پیدا ہوئی لیکن پشتو سے براہِ راست ناواقفیت کے سبب وہ اس پر قادر نہ ہو سکے۔

فارسی کے معروف شاعر فیضی نے "گیتا" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اقبال کے نزدیک اس نے گیتا کے مضامین اور اس کے اندازِ بیان کے ساتھ انصاف نہیں کیا، کیونکہ وہ گیتا کی روح کو گرفت میں نہ لے سکا۔ چنانچہ وہ اس کے ترجمے کی خواہش بھی رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں 'رامائن' کو بھی اردو میں ترجمہ کرنے کا ارادہ تھا لیکن وقت کی نامساعدت، ذاتی علالت، ضروری مواد کی فراہمی میں مشکلات اور عدیم الفرصتی کے باعث یہ تمام موعودہ تصانیف وجود نہ پا سکیں۔ اگر یہ سب کی سب یا کچھ نہ کچھ ضبطِ تحریر میں آگئی ہوتیں تو اقبال اس سے کہیں زیادہ عظیم مفکر، مصلح اور فلسفی نظر آتے جتنے آج ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کا مقالہ "اقبال مغربی خاورشناسوں کی نظر میں" تحقیقی اعتبار سے بہت سی اہم معلومات لیے ہوئے ہے انھوں نے مستشرقین اور مغربی محققین و مفسرین کی ان خدمات کا احاطہ کیا ہے جو اقبالیات کے سلسلے میں انھوں نے سرانجام دیں۔ اس سلسلے میں بالخصوص پینتالیس نام گنائے ہیں بلکہ اس فہرست میں مزید اضافے کا امکان ظاہر کیا ہے۔ ٹامس آرنلڈ کا تذکرہ اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے جنھوں نے اقبال کے زمانۂ طالب علمی تا ہیں ان کے جوہر

قابل کو شناخت کر لیا تھا۔ انھوں نے ہی کہا تھا کہ اقبال ایسا طالب علم، استاد کو محقق اور محقق کو زیادہ بہتر محقق بنا دیتا ہے۔ حالانکہ اقبال اس وقت محض ایک طالب علم تھے۔ وہ ابھی تک مغربی خاورشناسوں کی نظر میں آئے تھے وہی ان کا کلام یورپ تک پہنچا تھا۔ فاضل مقالہ نگار کی معلومات کا خلاصہ، اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اہلِ مغرب نے اقبال کے انقلاب انگیز اور تملکہ خیز فکر سے روشناس ہوتے ہی ان پر کام کا آغاز کر دیا۔ ان میں نکلسن کو اولیت حاصل ہے۔ آر۔ اے نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں اقبال کی شہرہ آفاق مثنوی "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہی مغرب میں اقبال کی شہرت کا سنگ بنیاد رہے اس وقت تک اقبال کے کلام کا کوئی انگریزی ترجمہ ہوا تھا، ہی انگریزی میں کوئی قابلِ ذکر مقالہ یا کتابِ اقبال کے متعلق شائع ہوئی تھی۔ اقبال کا مغرب میں مزید تعارف کا باعث A voice from the east. تھی جو نواب مالیر کوٹلہ کے بھائی نواب ذوالفقار علی خان کے ٹی سی ایس آئی کی کتاب تھی اور نکلسن کے ترجمۂ اسرارِ خودی کے دو برس بعد ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اقبال کا ایک نیا مجموعۂ کلام شائع ہوا تو رینالڈ اے نکلسن نے ایک طویل مقالے کی صورت میں اس پر تبصرہ کیا۔ اس موقع پر انھوں نے اقبال کی دونوں مثنویوں اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کا بھی جائزہ لیا۔ نکلسن کی یہ تحریر ۱۹۲۴ء کی ہے جبکہ اقبال کی مشہور تصنیف ابھی منظرِ عام The Reconstruction of Religious Thought in Islam. پر نہیں آئی تھی، جس میں اقبال کا فلسفہ مربوط صورت میں ملتا ہے۔ تاہم نکلسن نے محض ان کی دونوں مثنویوں اور "پیامِ مشرق" کے مطالعے سے اقبال کے فلسفۂ خودی، نظریۂ خدا، اور اس کے زمان و مکان کے تصور کو غیر مبہم اور سریع الفہم انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے نطشے اور اقبال کے ذہنی قرب و بُعد کا تجزیہ بھی کیا جسے کلاڈ روم نے The Poet of east لکھ کر اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے ایک نیا پہلو منکشف کیا اور اقبال کے فکری سرچشموں کا جائزہ لیا۔

پروفیسر آرتھر آربری نے بھی اقبال پر خاصا کام کیا۔ چنانچہ "زبورِ عجم" کا انگریزی ترجمہ Persian psalms. "پیامِ مشرق" کے حصۂ رباعیات "لالۂ طور" کا ترجمہ Tulips of Sinai. "شکوہ جواب شکوہ" کا ترجمہ 'Complaint and Answer' "رموزِ بیخودی کا ترجمہ Mysteries of Selflessness اور "جاوید نامہ" کا ترجمہ ان کے ایسے

کام ہیں جو اقبالیات کے حوالے سے انھیں زندہ رکھیں گے۔ زبورِ عجم اور جاوید نامہ کے ترجموں کی تمہید میں آرتھر آربری نے اقبال کے فکروفن پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ مطالعۂ نظم و نثر کے سلسلے میں آرتھر آربری نے اقبال کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا ہے، حتیٰ کہ جاوید اقبال کی مرتب کردہ اقبال کی ڈائری STRAY REFLECTIONS کا حوالہ تک بھی انھوں نے دیا ہے

مغربی خاورشناسوں میں ولفرڈ کانٹ ویل اسمتھ کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "موڈرن اسلام ان انڈیا" Modern Islam in India and Pakistan. کے دوسرے ایڈیشن (جو تقسیمِ ہند کے بعد چھپا) میں اقبال کے متعلق دو باب Iqbal the Reactionary [illegible] اور Iq[illegible] لکھے ہیں اس [illegible] ہے [illegible] ب سے [illegible] سمجھا ہے نہ ہمدردی سے پیش کیا ہے مگر پاک و ہند کی سیاسیات اور سماجیات کا کوئی طالب علم اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دریں اثنا وکٹر کیرنن کی توجہ اقبال کی اردو نظموں پر مرکوز ہوئی۔ ان کی کتاب Poems of Iqbal جو اقبال کی منتخب نظموں کا ترجمہ ہے اور جس میں مسجدِ قرطبہ جیسی عظیم تخلیق بھی شامل ہے، شعری تراجم کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے اور اقبال کے شعوری ارتقا کی ایک جامع تصویر پیش کرتی ہے۔

فرانسیسی خاورشناسوں میں ایوا میورووِچ اور لیوسی کلاد متیرے ہیں۔ ایوا نے دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام کو فرانسیسی میں ترجمہ کرنے کے بعد Development of Metaphysics in Persian کے ترجمے پر توجہ کی۔ اس کے علاوہ محمد مقری کے ساتھ مل کر "پیامِ مشرق" کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ لیوسی کلاد متیرے نے فکرِ اقبال پر ایک کتاب لکھی جس کا انگریزی ترجمہ مولانا عبدالمجید ڈار ریسرچ اسٹاف لا، لاہور نے کیا۔ یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے

مس شیلا میک ڈونو، سر جارج ولیم یونیورسٹی مونٹریال (کینیڈا) میں دینیات کے استاد نے اقبال کی نظم 'مسجدِ قرطبہ' پر ایک مقالہ لکھا جو اقبالیات اور ادبیات میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس میں انھوں نے اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری کا موازنہ کیا ہے۔

روسی مصنفہ مس ایم ٹی اسٹیپنٹس نے اپنی کتاب Pakistan Philosophy & Sociology میں اقبال کا فکری رشتہ شاہ ولی اللہ اور سرسید احمد خان کے ساتھ [illegible] ہے۔ اقبالیات کے تعلق سے اس روسی مصنفہ کا ایک خاص موضوع ہے: "اقبال

اس ضمن میں ان کا مقالہ "Problem of Ethics in Muhammad Iqbal's Philosophy" کے نظامِ فکر میں اخلاقیات کا مقام" کیفیت اور کمیت دونوں کے اعتبار سے اقبالیات میں بلند مقام کا حامل ہے۔

مشہور مستشرق، جرمن خاتون اینے میری شمل نے اقبال سے متعلق، دنیا کے ادب میں مقالات اور تقریروں کا انبار لگا دیا ہے۔ ان کی کتاب Gabriel's Wing اقبال کے مذہبی افکار کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔ انھوں نے جاوید نامہ کا بھی جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں فاضل مقالہ نگار نے اقبالیات کے تعلق سے ایک اور نایاب مسودے کی نشاندہی بھی کی ہے جو اس جرمن خاتون کی تحویل میں تھا۔ یہ پیامِ مشرق کے بعض حصوں کا جرمن ترجمہ تھا جو ارلنگن یونیورسٹی کے پروفیسر ہیل نے کیا تھا لیکن اس کی اشاعت سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔

محمد احمد خان نے اپنے مقالے "اقبال کی نظر میں علومِ جدیدہ" میں اقبال کے حوالے سے علومِ جدیدہ کا جائزہ لیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ جدید تعلیم کے تین بنیادی رہنما اصول ہیں: مشاہدۂ فطرت، استقرائی طرزِ استدلال، اور تجربی تحقیق۔ انھی اصولوں نے علومِ جدیدہ یا موجودہ سائنس کو جنم دیا ہے۔ انھی اصولوں کے ذریعے موجودہ سائنس نے فطرت کی بیشتر قوتوں کو مسخر کر لیا۔ اقبال ان تینوں اصولوں کے نہ صرف قائل بلکہ مداح ہیں، اور ان کی بنیاد پر جو علومِ جدید مدون ہوئے ان کے بھی حامی و مؤید ہیں۔ وہ ان علوم کو "علم اشیا" اور "حکمتِ اشیا" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جن کی طرف قرآن نے بھی بار بار اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کائنات میں پھیلی اپنی نشانیوں کی طرف واضح اشارے کرتے ہوئے نوعِ انسان بالخصوص مسلمانوں کو تسخیرِ کائنات کی ترغیب و تحریک دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب دعا مانگتے ہیں تو فرماتے ہیں "ربِّ زِدْنِی عِلْمًا"۔ مسلمانوں کو اس کی تلقین کرنے میں تو فرماتے ہیں: علم حاصل کرو مہد سے لحد تک۔ علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمھیں چین جانا پڑے۔ عرب کے وحشی قبائل اسلام لانے کے بعد جب طلبِ علم میں منہمک ہوئے تو بڑی بڑی دریافتیں اور ایجادات کیں۔ وہ اپنے علوم کو ان بلندیوں تک لے گئے کہ خود مغربی محققین نے ان سے استفادہ کیا۔ جس کا اعتراف و اظہار انھوں نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے۔ مثلاً گستاولی بان نے اپنی مشہور تصنیف "تمدنِ عرب" میں اور ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "معرکۂ مذہب و سائنس" میں۔ گویا بے شمار علومِ جدیدہ ایسے ہیں جو مسلمانوں کی علمی تحقیقات کا ثمر ہیں۔

اقبال بھی اس حقیقت سے واقف تھے چنانچہ وہ یہی دعویٰ نہیں کرتے کہ علوم جدیدہ مسلمانوں کی میراث ہیں بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جن اصولوں یعنی مشاہدۂ فطرت، استقرائی طرزِ استدلال اور تجربی تحقیق پر چل کر مسلمانوں نے ان علوم کو مدون کرنا شروع کیا تھا یا جن پر آج بھی موجودہ سائنس داں عمل کر رہے ہیں، وہ سب کے سب اسلام کے عطا کردہ ہیں۔ یہ اصول اس علمی و سائنسی جدوجہد میں مسلمانوں کے لیے رہبر و رہنما اور قوتِ محرکہ ثابت ہوئے تھے۔ اسی لیے اقبال مسلمانوں کو ان کے حصول کی موثر انداز میں ترغیب دیتے ہیں۔ اقبال اپنے دور کے مسلمانوں کو بار بار اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ وہ قرآن پڑھیں، اس کے اسرار و رموز سمجھیں، اپنی تخلیق کے مقصد اور خالقِ حقیقی کے منشائے تسخیرِ کائنات کو پہچانیں، علم اشیا اور حکمتِ اشیا سے واقفیت حاصل کریں۔ کیونکہ ان کے نزدیک جب ایک چھوٹی قوم بھی اپنی لگاتار محنت اور مسلسل جستجو سے حکمتِ اشیاء کا سراغ لگا لیتی ہے تو اپنی عددی کمتری کے باوجود زور آور قوموں سے خراج وصول کرنے لگتی ہیں۔

اقبال کی یہی وہ تعلیمات تھیں جن سے مغرب کے اہلِ دانش کے دل دہل گئے تھے انھوں نے اپنی تحریروں میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ اقبال مسلمانوں کو جو ترغیب دے رہے ہیں اگر مسلمان اس پر عمل پیرا ہو گئے تو ممکن ہے کہ بساطِ کائنات الٹ کر رکھ دیں اور مغرب کی اقبال مندی کا سورج ڈوب جائے۔ اس اعتبار سے اقبال کے کلام کو اہلِ مغرب کے لیے شگونِ نحس قرار دیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اہلِ مغرب نے تو اقبال کے کلام کی تہ میں کارفرما زلزلوں کا اندازہ کر لیا لیکن مسلمان اس سے حقیقی اور مکمل فیض آج تک حاصل نہ کر سکے۔ اقبال مسلمانوں کو یہ تلقین بھی کرتے ہیں کہ افرنگ کے عروج اور غلبہ و تسلط کا راز یہ ہے کہ اس نے اشیاء کی حکمتوں کا سراغ لگایا چنانچہ مظاہرِ فطرت اور آثارِ کائنات کو مسخر کر لیا۔ اس کی بنیاد انھوں نے اس علم و تحقیق پر رکھی جو مسلمانوں کا ورثہ تھا لیکن جنھیں بعد کے مسلمان اپنی بے عملی اور تن آسانی کے باعث فراموش کر چکے ہیں لہٰذا اب ضرورت آ پڑی ہے کہ اپنے ہی علوم اہلِ مغرب سے سیکھیں کیونکہ جدید ترقیوں کا تمام تر دار و مدار انھی پر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی زور دیتے ہیں کہ اس کے لیے اہلِ افرنگ کی بود و باش اور وضع قطع اختیار کرنا ضروری نہیں۔ البتہ ذہنِ رسا، فہمِ سنجیدہ، فکرِ چالاک اور طبعِ دراک لازم ہے۔

انقوش، کا ایک سو چوبیسواں شمارہ، جنوری ۱۹۷۹ء میں سالنامے کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ اپنے دیگر مشمولات کے علاوہ یہ شمارہ اقبالیات کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے چنانچہ

اس میں ایک حصہ صرف اقبال سے متعلق مضامین و مقالات کے لیے مختص کیا گیا۔ اس میں جو موضوعات زیرِ بحث آئے وہ یہ ہیں:

اقبال کا جشنِ صد سالہ	اقبال سے سعادت مندانہ ملاقاتیں
اقبال کے اردو کلام کا عروضی مطالعہ	اقبال کا شعری آہنگ
اقبال کے شاہین کا ایک اور مطالعہ	اقبال مجموعۂ اضداد یا دانائے راز
اقبال اور ہمارے فکری رویے	اقبال کے خطوط کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ
اقبال اور چغتائی	اقبال اور شاہ ولی اللہ
اقبال شاعرِ عالمِ اسلامی	اقبال اور پنجابی زبان و ثقافت
اقبال کی دعائیں	اقبال اور تربیتِ نژادِ نو

لکھنے والوں میں بڑے بڑے لکھاری شامل ہیں۔ مثلاً

قدرت اللہ شہاب	مولانا غلام مرشد
ڈاکٹر گیان چند	ڈاکٹر عبد الحق
ڈاکٹر سید محمد عقیل	پروفیسر فتح محمد ملک
ڈاکٹر سلیم اختر	عبداللطیف اعظمی
عبدالرحیم چغتائی	اختر راہی
پروفیسر ملک حسن اختر	پروفیسر نور احمد ثاقب،
کسریٰ منہاس	اور یعقوب ہاشمی

ستمبر ۱۹۸۲ء میں نقوش کا "عصری ادب نمبر" شائع ہوا۔ دیگر تخلیقات کے علاوہ اس میں اقبال پر بھی دو تحریریں شامل ہیں "مسجدِ قرطبہ" اور "اقبال اور ہماری ثقافتی تشکیلِ نو"۔

"مسجدِ قرطبہ" میں منظور الٰہی نے اس مسجد کا تاریخی پس منظر اجاگر کرتے ہوئے مسلمانوں کے عروج و زوال کی المناک داستان بیان کی ہے ساتھ ہی ساتھ ان اسباب و عوامل کا تذکرہ کیا ہے جو غیر مسلموں کے ہاتھوں مسلمانوں کی شکست اور تباہی و بربادی پر منتج ہوئے۔ اس سلسلے میں وہ اقبال کے اس خیال کے موید ہیں کہ یہ ساری تباہی مسلمانوں کی عیش پرستی، تن آسانی اور بے عملی کے باعث وقوع پذیر ہوئی۔ اسی وجہ سے مسجدِ قرطبہ جیسا عظیم الشان شہر اجڑا۔ اور اس کا دل یعنی مسجدِ قرطبہ ویران کر دی گئی۔ اس حوالے سے جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس پس منظر میں

ہر دور میں اور ہر خطۂ زمین کے مسلمان اپنے عروج و زوال کے اسباب و محرکات کو بخوبی محسوس کرسکتے ہیں نیز یہ کہ مسلمانوں کی یکجہتی اور اتحادِ کلمۂ توحید کی بنا پر ہے اور مسلمانوں کے اجتماع کے سلسلے میں مسجد کو مرکزیت حاصل ہے۔ جب یہ امر ان کے ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے تو غیر مسلم اقوام کو ان کی یکجہتی و اتحاد پارہ پارہ کرنے میں کوئی شے مانع نہیں ہو سکتی۔

"اقبال اور ہماری ثقافتی تشکیل نو" فتح محمد ملک کا ایک خطبہ ہے جو اقبال کے نظریۂ ثقافت پر اسلام آباد میں منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا۔ اس میں چونکہ بعض ابدی حقائق پیش کیے گئے ہیں اور یہ تحریر اپنے اندر مستقبل کی اسلامی ریاست کے لیے واضح اشارے رکھتی ہے۔ غالباً اسی لیے اسے عصری ادب نمبر میں محفوظ کر دیا گیا اس میں توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرائی گئی ہے کہ اقبال کے بعض دوسرے نظریات کی طرح ان کا نظریۂ ثقافت بھی قرآن حکیم سے ماخوذ ہے مگر اقبال کے عہد کی دنیائے اسلام کی ثقافت، ملوکیت کی پروردہ ہے۔ تصور اور حقیقت کے اس روح فرسا تضاد نے اقبال کی تخلیقی شخصیت کو ہمیشہ ایک اضطرابِ مسلسل میں مبتلا رکھا۔ اس اعتبار سے اقبال کی فکری اور فنی سرگرمی کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ اسلام کے مثالی تصورات کے تخلیقی انکشاف سے عبارت ہے تو دوسرا رُخ ان مثالی تصورات کو عملی زندگی کے متحرک قالب میں ڈھالنے کی جدوجہد کا آئینہ دار۔

اقبال درحقیقت ایک ایسی مثالی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھتے تھے جس کے باطن کو تغیر کا غم نہ ہو اور جس کا ظاہر ہر آن ایک تازہ تر انقلاب سے عبارت ہو۔ وہ مسلمان کو عجم کے حسنِ طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں کے ساتھ ساتھ روح القدس کے ذوقِ جمال سے متصف دیکھنے کے آرزومند تھے ایسی دنیائے اسلام اور ایسی زندگی و ثقافت ہم کیوں تخلیق نہ کر پائے؟ اس کے جواب میں فتح محمد ملک نے اقبال کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ اسلامی ثقافت کی نشوونما میں ایک زبردست رکاوٹ یہ امر تھا کہ مسلمان کشورکشائی میں مصروف ہو گئے اور انھوں نے کسی خاص خطۂ زمین کو مرکزیت دے کر اسلامی ثقافت کو مستحکم کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔ چنانچہ اقبال ایک اسلامی ریاست کا خواب اسی لیے دیکھتے تھے۔ پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے بھی اقبال نے کہا تھا کہ بحیثیت ایک کلچرل قوت کے ہندی مسلمانوں کی بقا کا انحصار ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرنے پر ہے۔ فاضل محقق نے اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے آخر میں اس حقیقت کی جانب متوجہ کیا ہے کہ ہمیں عرب ملوکیت یا جاہلیتِ خالصہ سے تائب ہو کر مسلمان بننا ہوگا۔ تب کہیں جا کر ہم اقبال کے نظریۂ ثقافت کے عملی ظہور کا منظر دیکھ پائیں گے۔

نقوش کا تحقیقی سرمایہ

"نقوش" سالنامہ ۱۹۸۵ء میں اقبال پر تین مقالات شائع ہوئے

اقبال عظمتِ انسان اور انقلاب کا شاعر — اقبال اثباتِ نبوت اور پاکستان

اقبال کے تصورِ خودی کی بین الاقوامیت

اوّل الذکر تحریر عطاء اللہ سجاد کی تحقیقی کاوش ہے اس میں اقبال کی شاعری کے حوالے سے اس انقلاب آفریں پیغام کی توضیح و تصریح ملتی ہے جس کے تحت اقبال نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں بلکہ تمام عالمِ اسلام کے مسلمانوں کو بیداری و اتحاد و یک جہتی کی تحریک دی۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کے تمام دنیا کے مظلوموں کو بھی۔ اقبال نے فرنگی استعماریت کے خلاف آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ مظلوموں کو استحصالی قوتوں کے خلاف صف آرائی اور نبرد آزمائی پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ البتہ مسلمان ہونے کے ناطے ان کی خصوصی توجہ اس حقیقت پر مرکوز رہی کہ مسلمان بالخصوص یاسیت، پژمردگی اور تقدیر پرستی کے تحت پیدا ہونے والی بے عملی سے نکل کر اپنی اصلیت و حقیقت کو پہچانیں۔ اپنی ذات اور اس کے اندر خفتہ بے پناہ صلاحیتوں، قابلیتوں اور قوتوں سے آگہی حاصل کریں۔ اور منشائے الٰہی یعنی تسخیرِ کائنات کا فریضہ پورا کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بار بار انسانی عظمتوں اور اس کی تخلیقی و تعمیری صفات کا تذکرہ کیا۔ اس طرح مسلمانوں کے اندر احساسِ عظمت کے ذریعے خود اعتمادی کی بیداری، تربیت اور پختگی پر مسلسل زور دیتے ہیں۔ انھیں غلامی سے آزادی کا خواب دکھاتے رہے۔ اقبال کا انقلاب آفریں پیغام دور و نزدیک پھیلتا چلا گیا اور خود ان کی زندگی ہی میں اس کی تاثیر بھی ظاہر ہونے لگی۔

پروفیسر فتح محمد ملک کی تحریر ایک فکر انگیز کاوش ہے انھوں نے تصورِ پاکستان کا پس منظر اجاگر کرتے ہوئے بعض اہم حقائق کا تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے بالخصوص اس امر کی تصریح کی ہے کہ جب اسلام کے نام پر تصورِ پاکستان کی مخالفت نے زور پکڑا حتیٰ کہ مولانا حسین احمد مدنی کے سے عالمِ دین نے بھی اسلام کی رُو سے متحدہ ہندوستانی قومیت کی تائید کی اور جداگانہ مسلمان قومیت کی تردید پر اصرار کیا تو اقبال نے یوں استدلال کیا:

> "حضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپؐ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر، جو ہمارے درمیان موجود ہے ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ

راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، لیکن نبیِ آخر الزماں کی رائے نہ ہوتی۔ نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جلسے جو اپنے وقت کے ہر لحظے سے 'ابدیت' سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔[۲۲]

اس پس منظر میں مقالہ نگار نے متحدہ ہندوستانی قومیت کے خلاف کی جانے والی تاریخی جدوجہد کا جائزہ بھی لیا ہے اور مقامِ رسالتؐ کے اثبات کے سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ کی کاوشوں کا تذکرہ بھی کیا ہے نیز مختلف تحریکات کے تاریخی حوالوں کے تناظر میں اقبال کے تصورِ اثباتِ رسالتؐ اور اس کی اتباع کے لیے ایک ریاست کے قیام اور اس میں احکامِ شریعت کے نفاذ کے تصورات کی حقیقت واضح کی ہے۔

ڈاکٹر محمد حنیف فوق کی تحریر بھی توجہ طلب ہے جو اقبال کے تصورِ خودی کو انفرادی احساسِ خودی سے بڑھا کر اجتماعی احساسِ خودی کے وسیع مفہوم سے ہم آہنگ کرنے کا مظہر ہے۔ ان کے نزدیک اقبال نے اپنے آپ کو تخلیقِ مقاصد سے زندہ بنایا ہے، لیکن یہ تخلیقِ مقاصد تسخیرِ فطرت تک تو لے جاتی ہے، انسانوں کو مسخر کرنے کا درس نہیں دیتی چنانچہ اپنی ذات کے اثبات سے دوسروں کی ذات کی بھی نمود ہے کہ اقبال کے مطابق خودی میں صد جہاں پوشیدہ ہیں لہٰذا جس مقاصد سے انسان زندہ ہے، ان میں ایک اہم مقصد اپنے جہان اور دوسرے جہانوں کی پہچان بھی ہے اسی سے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا بین الاقوامی اور آفاقی نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے ایک محدود دائرے میں اقبال کا تخاطب اگرچہ ہندوستان کے مجبور و بے کس مسلمانوں سے محسوس ہوتا ہے لیکن یہ تخاطب جب اپنا دائرہ وسیع کرتا ہے تو تمام عالمِ اسلام اس کے اندر سمٹ آتا ہے پھر جب اس میں مزید توسیع ہوتی ہے تو یہ دائرہ کل کائنات کے تمام مظلوم و مجبور، بیکس و لاچار انسانوں تک پھیل جاتا ہے یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جسے ڈاکٹر فوق نے اقوامِ عالم کے تناظر میں پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی بڑائی یہ ہے کہ وہ اپنے تصورِ خودی کو اپنی تمام فکری اور خلاقانہ استعداد کے ساتھ عصرِ حاضر کی حقیقتوں کا جائزہ لینے میں صرف کرتے ہیں۔ وہ اسے ایک ہمہ گیر معنویت بخشتے ہیں اور انفس و آفاق کی یکجائی کا وسیلہ بنا دیتے

ہیں۔ لیکن آفاق کی وسعتوں میں اقبال کے نزدیک انسان کی جستجو ہی سب سے مقدم ہے۔
انسانی خودی انقلاب پسند ہے۔ انقلاب کی غایت سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر فوق لکھتے ہیں:

"غایتِ انقلاب انسانی محبت کی تشکیل کردہ بین الاقوامی رابطوں کا قیام ہے۔
انقلابات جہاں نقوشِ گزراں ہیں لیکن انسانی محبت قدرِ دائمی کی حیثیت رکھتی ہے۔
انسانی اقدار کی جستجو کا عمل آخر کار محبت ہی کو حاصل ٹھہراتا اور انسان کے ماورائی فکر
کی سلسلہ در سلسلہ نشان گاہوں کی روشنی بھی شاید محبت ہی کے دم سے قائم ہے
...... اقبال نے اسے بین الاقوامی انسانیت دوستی کی جہت دے کر اپنے دور
کی سیاستِ استعمار کے خلاف حریتِ فکر و عمل کی علامت بنا دیا ہے۔"[۲۳]

یہ ایک مختصر جائزہ ہے نقوش کے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۵ء کے درمیان شائع شدہ خاص خاص شماروں کا۔ اگر اس کے سن اجرا سے اب تک کے تمام خاص و عام شماروں کا جائزہ لیا جائے تو اس سرمائے میں مزید اضافہ ممکن ہے۔ بہرحال اس مختصر مطالعے سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقبال کا ان متنوع پہلوؤں سے جائزہ ایک جانب اقبال کی سیرت و سوانح اور ان کے نظریات و رجحانات پر روشنی ڈالتا ہے تو دوسری جانب اقبال پر تحقیق کے نئے گوشے کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ بالخصوص اقبال کے تمام خطوط اور خطبات کے حوالے سے کام کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ علاوہ ازیں اہل مغرب نے اقبال پر جو کام کیا ہے اس کی نوعیت، اہمیت اور افادیت بھی توجہ طلب ہے اقبال کے مغربی تراجم کا ان کے اصل کلام کے ساتھ موازنہ، ان تراجم کا معیار، ان کی قدر و قیمت اور حسن و قبح کا تعین بھی کیا جانا چاہیے۔ اقبال کے مغربی شارحین، ناقدین اور محققین نے علیحدہ علیحدہ ان کا جن مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے اس میں ان کا جو نقطۂ نظر کارفرما رہا ہے، ان میں سے ہر پہلو ایک نئے موضوع کی تحقیق کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ اقبال کی موجودہ تصانیف پر بھی مزید بحث کی گنجائش ہے۔ اقبال کی دعاؤں اور تحصیل علوم جدیدہ کے حوالے سے اقبال سے قوم کو مستقبل کے لیے جو رہنمائی مل سکتی ہے یہ بھی مزید تحقیق طلب ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے موضوعات ابھی تشنہ ہیں۔ بالخصوص عصری تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تفہیم کلام سے آگے بڑھ کر ان کی نثری تحریروں پر بھرپور توجہ دی جائے اور ان کے رہنمایانہ اصول و نظریات خصوصاً علمی اور تحقیقی رجحانات و تصورات کو مزید واضح کیا جائے اس کے

لیے تاریخ، بالخصوص اسلامی تاریخ کو پس منظر کے طور پر پیش نظر رکھا جائے، کیونکہ اقبال کے تصورات و نظریات کو جس طرح قرآن و حدیث نے بنیادی طور پر متاثر و مستفیض کیا، اسی طرح تاریخ اسلامی کا بھی ان کے فکری ارتقا میں بڑا حصہ ہے۔

حواشی

۱۔ خدیجہ مستور، "نقوش کے خاص نمبر" نقوش، افسانہ نمبر ۱۹۶۸ء، ادارۂ فروغ اردو، لاہور ص ۴۱
۲۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، "مجلاتی صحافت میں نقوش کا مقام" ایضاً ص ۱۶۔۱۸
۳۔ خواجہ شہاب الدین، خطبۂ صدارت، ایضاً، ص ۶
۴۔ مکتوب اقبال بنام مولانا گرامی، نقوش، خطوط نمبر، ج ۱، ص ۲۴
۵۔ ایضاً (مکتوب مورخہ ۲۱ مئی ۱۷ء) ص ۲۶
۶۔ مکتوب اقبال بنام مولانا گرامی (مورخہ ۷ جنوری ۱۹۲۲ء)۔ ص ۲۷
۷۔ ایضاً (مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء)۔ ص ۲۸
۸۔ مکتوب اقبال بنام ڈاکٹر حبیب النساء (مورخہ یکم جولائی ۱۹۳۷ء)۔ ص ۳۶۴
۹۔ مکتوب اقبال بنام مولانا ہزاروی (مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۰ء) ص ۳۷۴
۱۰۔ مکتوب اقبال بنام شاد عظیم آبادی (مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۴ء) ص ۴۸۷
۱۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، "اقبال بارگاہِ رسالتؐ میں" نقوش، اقبال نمبر ۱۹۷۷ء ج ا، ص ۶۳
۱۲۔ میرزا ادیب، "اقبال کی دعائیں"۔ ایضاً، ص ۷۷
۱۳۔ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، "اقبال کا نظریۂ تاریخ"۔ ایضاً۔ ص ۲۲۰
۱۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا، "اقبال اور بیداریِ ذات"۔ ایضاً۔ ص ۲۲۶۔۲۷۱
۱۵۔ ڈاکٹر نجم الاسلام، "رسالہ معارف اور اقبال"۔ ایضاً
۱۶۔ پروفیسر سلیم اختر، "اقبال کا نفسیاتی مطالعہ"۔ ایضاً۔ ص ۱۸۴
۱۷۔ نقوش، اقبال نمبر، شمارہ ۱۲۲، نومبر ۱۹۷۷ء

۱۸۔ ڈاکٹر وحید قریشی، علامہ اقبال کی تاریخ ولادت، نقوش، اقبال نمبر، ج ۲، ص ۹-۲۲

۱۹۔ اقبال کی "تاریخ تصوف" پر پروفیسر صابر کلوروی کی ترتیب و حواشی کے ساتھ مکتبہ انسانیت، لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ترتیب یہ ہے۔

تاریخ تصوف کا ابتدائی خاکہ — تصوف کی ابتدا کیونکر ہوئی

تصوف کے ارتقاء پر ایک تاریخی تبصرہ — حسین بن منصور حلاج

تصوف اور اسلام — تصوف اور ہماری شاعری

علاوہ ازیں بطور ضمیمہ متفرق اشارات اور اقبال کے ماخذ و مصادر۔

۲۰۔ محمد احمد خان، "اقبال کی نظر میں علوم جدیدہ"، اقبال نمبر، ج ۲، ص ۲۲۷، ۲۳۹

۲۱۔ فتح محمد ملک، "اقبال اور ہماری ثقافتی تشکیل نو"، نقوش عصری ادب نمبر، ۱۹۸۲ء، ص ۸۲۶

۲۲۔ نقوش، سالنامہ ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۲

۲۳۔ ڈاکٹر محمد حنیف فوق، "اقبال کے تصور خودی کی بین الاقوامیت"، نقوش سالنامہ ۱۹۸۵ء، ص ۴۰۵

Some English Books of Iqbal Academy

Gabriel's Wing
Dr. Annemarie Schimmel
Rs. 150.00

******

Rumi's Impact on Iqbal's Religious Thought
Dr. Nazir Qaiser
Rs. 140.00

******

Iqbal and his Contemporary Western Religious Thought
Dr. M. Maruf
Rs. 120.00

******

Concept of Self and self - Identity (in Contemporary Philosophy)
Dr. Absar Ahmad
Rs. 125.00